اکابر امت کا ایک پیغام

اہل مدارس کے نام

حضرت مولانا محمد عبدالقوی صاحب حیدرآباد دامت برکاتہم

ناظم مدرسہ اشرف المدارس حیدرآباد

حضرت مولانا صلاح الدین سیفی صاحب دامت برکاتہم

خلیفہ حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی دامت برکاتہم

پیش کردہ:

جامعہ خیر العلوم اسعد آباد، ادگاؤں

گٹ نمبر/ ۱۰۹۹ اشرول روڈ تعلقہ شرول ضلع کولہاپور مہاراشٹر



پیش گفتار

ذمہ داران مدارس کی خدمت میں!

از: مدیر

امام احمدؒ نے مسند (۳/ ۱۵۴) میں اور امام بیہقی نے سنن (۴/ ۷۸) میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا ہے کہ ''جس شخص کے پاس امانت داری نہیں اس کا ایمان نہیں اور جس کے پاس وفاداری نہیں اس کا دین نہیں''۔ اسی طرح بخاری و مسلم رحمہا اللہ (بخاری: ۶/ ۱۸۵) نے بہت ہی تفصیل کے ساتھ ایک روایت نقل کی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ لوگ قیامت کے دن اپنے سروں پر خیانتوں کے اموال اٹھا کر لائیں گے، اس بوجھ سے نجات کیلئے انہیں سوائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اور کوئی مددگار نظر نہ آئے گا، مگر جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مدد طلب کریں گے کہ کسی طرح اس مصیبت سے نجات دلا دیجئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے جواب میں صاف ارشاد فرمائیں گے: حقوق العباد کے معاملے میں ''میں تمہاری مدد نہیں کرسکتا، خیانتوں کے اس انجام کے بارے میں تو میں نے دنیا ہی میں تمہیں بتلا دیا اور تبلیغ کا حق ادا کر چکا تھا''۔ کل قیامت کے ہولناک دن پیش آنے والی اس صورتحال کی اللہ تعالیٰ سے علم پا کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کو نہ صرف خبر دی بلکہ تاکید فرمائی کہ ''خبردار! میں تم میں سے کسی کو اس صورتحال میں نہ دیکھوں''۔ ایک اور حدیث (بخاری: ۱۱/ ۵۹۲) میں ہے کہ کسی سفر میں ایک جگہ پڑاؤ ڈالا جا رہا تھا، لوگ سواریوں پر سے سامان اتار رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خادم مِدعم آپ کی اونٹنی کا سامان کھول رہے تھے کہ

حضرت مولانا محمد عبدالقوی صاحب حیدرآباد دامت برکاتہم ناظم مدرسہ اشرف المدارس حیدرآباد

اچانک کسی دشمن اسلام نے انہیں اپنے تیر کا نشانہ بنایا، وار اتنا طاقتور تھا کہ وہ اپنی زندگی بچا نہ سکے، مگر صحابہ کرامؓ نے جب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کی شہادت کا مژدہ سنایا تو آپ نے فرمایا ''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اس شخص کے عمامے پر جو اس نے خیبر کی غنیمت میں سے تقسیم سے قبل لے لیا تھا آگ بھڑک رہی ہے''۔ صحابہ کرامؓ اس سچی خبر اور خیانت کے اس خوفناک انجام سے اس قدر خوفزدہ ہوئے کہ انہوں نے اپنے اموال میں غور کرنا شروع کیا، کوئی معمولی سے معمولی چیز میں بھی شبہ ہوا تو لا کر خدمتِ اقدس میں پیش کردی، یہاں تک کہ ایک لانے والا مفتوحہ علاقے میں پڑا جوتے کا تسمہ اپنے جوتے میں لگا لیا تھا تو وہ بھی لا کر خدمتِ والا میں پیش کردیا، آپ نے ان لوگوں سے فرمایا'' یہ جہنم کی آگ کے تسمے ہیں''۔ یعنی تقسیم سے قبل جو مال بھی مالِ غنیمت میں سے کوئی لے گا تو وہ اس کا حق نہیں ہے عنداللہ خیانت شمار ہوتا ہے جو نارِ جہنم میں لے جانے کا سبب بن جاتا ہے۔

یہ اور ان کے علاوہ بے شمار صاف وصریح روایات اور آیات ایسی ہیں جن سے دینِ اسلام میں "امانت وخیانت" کے مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، جب بے امانت شخص کو بے ایمان[1] تک کہہ دیا گیا تو اور کس وعید کی ضرورت ہے؟ اسی لئے ہمارے سماج کے عام بول چال میں تک بے ایمانی کا لفظ بددیانتی کا مترادف بن گیا ہے، ایک کافر بھی کہتا ہے "بے ایمانی مت کرو، ایمانداری کی بات کرو، وغیرہ" جب امانت اور ایمان کا اتنا قریبی رشتہ ہے تو صحابہ کرامؓ اور اولیاءِ عظام اس کی اہمیت سے غفلت کیوں کر برت سکتے تھے؟ چنانچہ صحابہؓ کے ہاں دین کا پیمانہ دیانت ہی قرار پا گیا تھا، امیر المؤمنین عمر فاروقؓ کے سامنے کسی شخص کی دیانتداری کی شہادت دی گئی، آپ نے شہادت دینے والے سے پوچھا: کیا تم نے اس کے ساتھ کوئی معاملت کی؟ اس کے پاس کوئی امانت رکھوائی؟ اس کے ساتھ کبھی سفر کیا؟ جب اس نے نفی میں جواب دیا تو آپ نے پوچھا: پھر کس چیز سے اس کی دیانت کا پتہ چلایا؟ بس مسجد میں راتوں کو لمبی لمبی نفلیں پڑھتا ہوا دیکھ لیا ہوگا اور سمجھ لیا کہ یہ بہت دیندار و دیانتدار آدمی ہے، یعنی زہد وطاعت اور کثرتِ عبادت سے کسی کی دین و دیانت پرکھی نہیں جاتی، بلکہ معاملات کی صفائی، وعدہ وفائی اور حقوق کی ادائی کے ذریعہ دین

ودیانت کا اندازہ کیا جاتا ہے کہ جو اس میں خوفِ خدا اور حساب کا احساس رکھتا ہے حقیقت میں وہ ایمان دار و دیانتدار کہلانے کا مستحق ہے۔ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۴۰﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۴۱﴾ اور جو کوئی اللہ سے نہیں ڈرتا، ہر چہ آمد در گھسیٹ کا مصداق بنا رہتا ہے اس کا دین اور ایمان مشکوک اور غیر محفوظ رہتا ہے، فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿۳۷﴾ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۳۸﴾ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۳۹﴾ مختصر یہ کہ اسلام نے امانت و دیانت کو معیارِ ایمان اور بدعہدی و خیانت کو معیارِ نفاق بتلایا ہے، حدیث (بخاری: ۱/۸۹) میں ہے: اَرْبَعٌ مَّنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقًا كَامِلاً وَمَنْ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِّنْهُنَّ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِّنَ النِّفَاقِ۔ اہلِ علم و صلاح کیلئے یہ احادیث مشتے از خروارے ہے ورنہ وہ خود اس سلسلے کی آیات و احادیث سے خود ہی بہت واقف ہیں۔

ان آیاتِ شریفہ و احادیثِ مبارکہ کا جو اثر صحابہ کرامؓ کے اخلاق پر پڑا پڑا ہی امت کے علماء اور اولیاء پر بھی اس کا غیر معمولی اثر پڑا، بالخصوص ہمارے اکابر علماء دیوبند رحمھم اللہ و کثر امثالھم دیگر صفات کی طرح اس معاملے میں بھی اپنا ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں، تاریخ ان واقعات سے بھری پڑی ہے جو معاملات و مالیات میں ان کی خدا ترسی و خشیتِ الٰہی کی منھ بولتی تصویریں ہیں۔

● امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے بارے میں آتا ہے کہ جب انہوں نے بصارت سے محرومی کے بعد تدریس کا سلسلہ بند کر دیا تو یہ معمول بنالیا کہ جو رقومات و ہدایا خانقاہ کو پہونچتیں انہیں یہ کہہ کر واپس بھیج دیتے تھے کہ اب یہاں درس و تدریس کا سلسلہ موقوف ہے، لوگوں نے کہا بھی کہ کسی اور مصرف میں استعمال کی اجازت لے لی جائے مگر آپ نے اسے بھی پسند نہیں فرمایا، یہ دیانت و امانت ہی کی بات ہے کہ عقیدت مند تو بھیجنے کا سلسلہ موقوف نہیں کرتے مگر حضرت لینے کا سلسلہ بند کر دیتے ہیں، حالانکہ کسی اور مصرف میں صرف فرما سکتے تھے، سب کارِ خیر تو بند نہیں ہوئے تھے، مگر ان کے اندر موجود دیانت اور روز قیامت حساب و کتاب کی نزاکت انہیں مجبور کرتی تھی کہ بآسانی خطیر رقمیں اور کثیر آمدنیاں واپس فرمادیں۔ کیا ہم ایسا کر سکتے ہیں کہ

جو کام ختم ہو گئے یا کم ہو گئے ان کے حوالے سے ملنے والی رقومات واپس کر دیں؟ ہم تو اشارۃً کنایۃً حتی کہ دبی زبان ہی سے سہی اس کو اطلاع دینے کے لئے تیار نہیں ہوں گے کہ اب ہمارے ہاں یہ مصرف نہیں رہا آپ کہیں اور صرف کر دیں۔

● حضرت مولانا احمد علی سہارنپوریؒ کو تعمیرِ مدرسہ کے سلسلہ میں کلکتہ بھیجا گیا، کافی بڑی رقم اپنے تعلقات کی وجہ سے مدرسہ کے لئے لیکر آئے، جب حسابات پیش کئے تو اخراجاتِ سفر میں ایک مقام پر جانے آنے کا کرایہ اپنی تنخواہ میں سے یہ کہہ کر وضع فرمایا کہ وہاں اگرچہ چندہ بہت ہوا مگر جانے کی نیت ایک دوست سے ملنے کی تھی چندہ کرنے کی نہ تھی۔سوچئے کہ یہ کیا احتیاط ہے اور کیسی پرہیزگاری ہے؟ کیا آج سفراء حضرات بلکہ وہ علماء جو تعطیلات میں یا خصوصی مواقع پر فراہمی سرمایہ کیلئے مدرسوں اور دینی اداروں سے بھیجے جاتے ہیں وہ حساب وکتاب کے پیش کرتے وقت ایسی دیانت داری و پرہیزگاری کا ثبوت دے سکتے ہیں؟ یہاں تو صورتحال یہ ہے کہ دوست نے کھانا کھلا دیا تو بھی خرچہ میں لکھواتے ہیں، چاۓ نہیں پی تھی تو بھی خرچ میں ڈال دیتے ہیں، پیدل گئے تھے تو بھی کرایہ شمار کرا دیتے ہیں، اور بھی ایسی ایسی خیانتیں علم میں آئی ہیں کہ لکھنے کو جی نہیں چاہتا، کمیشن کی نحوست نے تو اس عظیم خدمت کو ایسا کاروبار بنا دیا ہے کہ ڈوب مریں تو بہتر ہے۔

● مہتمم دارالعلوم دیوبند نے حضرت حکیم الامتؒ سے معلوم کروایا کہ مدرسہ میں مہمان آتے رہتے ہیں، کیا مدرسہ کی جانب سے ان کی ضیافت کی جاسکتی ہے؟، حضرتؒ نے جواب دیا: اگر اس مہمان کے آنے سے مدرسہ کا معتد بہ نفع ہے تو مدرسہ سے ضیافت کر دی جائے ورنہ خدام مدرسہ میں سے کوئی انہیں اپنا مہمان بنالے۔یعنی اکرامِ ضیف سے پہلو تہی بھی نہ کی جائے اور مدرسہ کے مالیے کا استعمال بھی مشکوک نہ ہونے پائے۔

● شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ کے ساتھ بہت سے علماء وصلحاء مظاہر کی مسجد میں معتکف ہوتے تھے ان میں بہت سے امراء بھی ہوتے تھے، ان کا آنا ملک بھر میں مدرسہ کے تعارف اور آمدنی کا مؤثر ذریعہ بھی تھا، مگر شیخ نہ صرف یہ کہ ان سب کو شخصی مہمان بناتے تھے بلکہ ایک مہینے کا کرنٹ کا بل بھی خود ادا کرتے تھے کہ میرے مہمانوں کی وجہ سے بجلی زیادہ استعمال ہوئی ہے۔

● قریب زمانے میں عارف باللہ حضرت قاری صدیق احمد صاحب باندوی رح گذرے ہیں، مقبولیتِ عامہ کی وجہ سے ہزاروں لوگوں کی آمدورفت رہتی تھی، حضرت ان کو اپنا مہمان سمجھتے تھے، کبھی مدرسہ سے کھلا بھی دیتے تو اپنے جیب سے اس کی قیمت جمع فرمادیا کرتے تھے۔

کیا آج ہم بھی مدارس میں ایسی احتیاط برت رہے ہیں؟ ہم تو اپنے مہمانوں کا بار بھی کسی بہانے مدرسہ کے مطبخ پر ڈال دینے میں پیچھے ہٹنے والے نہیں رہے۔

● محی السنۃ حضرت ہردوئی رح اپنے زیر انتظام مدارس کے حسابات خود جانچتے تھے اور کسی صرفے میں ذرا بھی کھٹک ہوتی تو اسے مدرسہ سے منظور نہیں فرماتے تھے، ایک مرتبہ ایک مدرسہ والوں نے رسید کا مضمون اور ڈیزائن تبدیل کرکے معروف کاتب سے اچھی کتابت کروالی تھی، جس پر سوروپئے کا صرفہ آیا، جب حضرت رح نے حسابات میں اس کو دیکھا تو فرمایا: اس تبدیلی کی کوئی ضرورت نہ تھی، ایک تو عوام میں رسید کی وضع بدلنے سے شبہ پیدا ہوگا، دوسرے کام تو اس سابقہ وضع کی رسیدوں سے بھی چل رہا تھا اس لئے یہ مصارف بلاضرورت ہوئے، پہلے خلجان کا حل یہ نکالا کہ ان رسائد کو اندرون مدرسہ استعمال کرکے ختم کرلیا جائے اور عام استعمال کے لئے رسیدیں سابقہ وضع ہی پر چھپتی رہیں، دوسرے خلجان کا مداوا اس طرح فرمایا کہ: جن مقامی ذمہ داروں نے ایسا کرنا طئے کیا تھا وہ اپنے جیب سے اس زائد خرچ کا بوجھ اٹھالیں یہ رقم مدرسہ جاری نہیں کرے گا، چنانچہ تین آدمیوں نے مساوی طور پر اس خرچ کو تقسیم کرکے مدرسہ میں جمع کروادیا۔

یہ چند واقعات میں نے بعض اکابر کے بطور مذاکرہ و یاددہانی کے یہاں رقم کردئے ہیں جو آپ حضرات کے علم میں پہلے سے ہیں اور ان کے علاوہ بھی آپ بہت کچھ جانتے ہیں۔ اصل وجہ ان کے ذکر کی اس امر کی جانب اپنی اور احباب کرام کی توجہ مبذول کرنا ہے کہ فی زماننا مدارس کے مالیات کا استعمال دن بہ دن نامناسب شکل اختیار کرتا جارہا ہے، تعلیم سے زیادہ تعمیر کی فکر ہے اور کام کی توسیع سے زیادہ وصولی کی تکثیر پر نظر ہے، عمارات میں تقابل وتفاضل دیکھنے میں آرہا ہے، مصارف میں قدر ضرورت پر اکتفا کیا جاتا ہے نہ محل صرف کی واجبیت کا اندازہ کیا جاتا ہے، صدقات واجبہ کی تملیک یا تو مدنظر ہی نہیں یا نہایت استخفاف کے ساتھ کرلی جاتی ہے، حیلۂ تملیک

مواقع خاصہ تک محدود ہونے کے بجائے عام کرلی گئی ہے، وصولیٔ سرمایہ میں بھی احتیاط نہیں ہے، کمیشن کے جواز اور رواج نے اس کام میں اخلاص وللّٰہیت کو ختم کردیا ہے، ان جگہوں پر جہاں اس پر عمل ہے بہت ہی افسوس ناک صورتحال ہوگئی ہے۔ بہت سی جگہ ذمہ داروں کے مصارف متعین نہیں، وہ جو کچھ خرچ کریں سب مدرسہ کا بوجھ ہے، طلبہ کی ضروریات اور حاجات کی فکر بہت کم ہے حالانکہ زکوٰۃ وصدقات کی رقومات نہ استعمال ہوسکنے کی وجہ سے انہیں سے تملیک کراکے دوسرے کاموں میں صرف کی جارہی ہے، مگر ان کے لباس خوراک اور شخصی ضروریات پر مستحق ہونے کے باوجود کما حقہ توجہ نہیں کی جارہی ہے۔ علاقائی مدارس میں طلبہ کی تعداد مختلف معلوم اسباب کے تحت گھٹتی جارہی ہے، اہل مدارس اس کا رونا تو رورہے ہیں مگر اپنی توجہات اور سرگرمیاں مکاتب کی طرف مبذول کرنے کے لئے تیار نہیں، حالانکہ اس سے خوشگوار اور مثبت تبدیلیوں کی توقع ہے، اس کے برخلاف موجودہ صورتحال یوں ہی زوال پذیر رہی اور اہل مدارس اپنے اطراف واکناف مکاتب کا جال نہ پھیلاسکیں تو اندیشہ ہے کہ جس طرح یورپ میں عدم استعمال کی وجہ سے چرچ فروخت کئے جارہے ہیں ہمارے مدارس کی یہ بڑی بڑی عمارتیں بیچ دینے کی نوبت نہ آجائے، بعض علمائے کرام بھی جن کے پاس وسائل مالیہ ہیں وہ ان کے صرف میں علاقے کی ضرورت کا پورے طور پر سروے نہیں کر پارہے ہیں، بس پیچھے لگے رہنے والوں کے اصرار پر کروڑوں روپئے خرچ کرکے ایکروں زمین پر وسیع وعریض عمارات کا ایک دارالعلوم بنوادیتے ہیں، چھوٹی جگہوں پر اچانک اتنی بڑی مسلم پراپرٹی کو دیکھ کر حاسد اور دشمن الگ جلنے لگتے ہیں اور کام کی مقدار اس عمارت کے اعتبار سے افسوس ناک حد تک قلیل ہوتی ہے، ابھی اس ادارہ کی مقبولیت ومرجعیت تو کیا تعارف بھی پورا نہیں مگر مہمان خانہ عظیم الشان اور باقاعدہ ایک مدرسہ کے برابر ہوتا ہے، جس میں شاید وباید مہمانوں کے قیام کی نوبت آتی ہے۔ ان کے مقابلے میں کئی مدارس ضرورت کے مقام پر قائم ہیں، خوب کام کررہے ہیں مگر اسبابِ ظاہری سے محروم ہیں ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ اگر ہم سمجھتے ہیں کہ اسلام کی شوکت پرشکوہ عمارتوں ہی سے ہے تو یہ ہماری بہت بڑی بھول ہے جس کی ہمارے طبقے سے توقع بھی نہیں کی جاسکتی۔

انبیاء کرام کی تاریخ تو کھلی کتاب ہے ہی اولیاء کرام اور اسلاف عظام کے احوال بھی ذہنوں سے اوجھل نہیں کہ اصل چیز جہد وعمل اور امت کے غم میں گھلنا مرنا ہے۔ سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ وہ جو اسلامی دنیا کی عظیم الشان عمارات ہیں بخارا وسمرقند کے مدارس اور عالم اسلام کی تاریخی مساجد یہ علماء کرام کی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہیں، خلفاء وامراء کی خواہشات کی دین ہیں، علماء نے ہمیشہ کام اور فکر پر توجہ مرکوز کی، وسائل کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا، اللہ تعالیٰ نے اہل خیر کے قلوب کو متوجہ کیا تو وسائل بھی بقدر ضرورت انجام پاتے گئے، بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ مخلص علماء وسائل کی بہتات کو آزمائش سمجھتے اور اس سے گھبراتے رہے، اور اب صورتحال یہ ہے کہ بہت سے ذمہ دار حضرات نے مدرسہ کو چند معلموں کے حوالے کر کے اپنی ساری تگ ودو وسائل ظاہرہ کے پیچھے وقف کر رکھی ہے، اس کی وجہ غور کرنے سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ نو فارغ اور غیر تربیت علماء جو ماتحتی کا داغ اپنے دامن پر دیکھنا نہیں چاہتے اور ضرورت ہونے نہ ہونے کا اندازہ کئے بغیر نیز بڑوں سے مشورے لئے بغیر مدرسے قائم کرتے چلے جارہے ہیں، ذرا ناظم سے اختلاف ہوا مستعفی ہو کر دوسرا مدرسہ کھول لیا، جگہ خریدنے اور عمارت بنانے میں لگ گئے، ابھی فارغ ہو کے آئے، کوئی تجربہ کام کا نہیں مدرسہ شروع کر دیا، دس بیس بچوں کو لے کر بیٹھ گئے۔ کام برائے نام اور جلسے عظیم الشان ہو رہے ہیں۔

ایک علاقہ کے ذمہ دار مدرسہ نے مجھے جلسے میں بہت اصرار سے دعوت دی، مجھے ایسا لگا کہ دو چار علماء ہوں گے،، بہت دور کا سفر تھا تو میں ہوائی جہاز سے پہونچا اور اس کے لئے بہت کام آگے پیچھے کرنے پڑے، جب وہاں پہونچا تو دیکھا کہ بہت بڑا جلسہ ہے اور پوری ریاست اور اطراف واکناف سے ۲۴/ اکابر علماء بلائے گئے ہیں (سب کو ایسا ہی اندھیرے میں رکھ کر بلایا ہوگا) لاکھوں روپیہ تو صرف کرایوں پر صرف کیا، معلوم ہوا کہ ساؤتھ آفریقہ سے چندہ لاتے ہیں اور یوں کھپاتے ہیں، اس گاؤں میں ذرا ذرا سے فاصلے سے کئی مدارس ہیں، میں نے خود تین دیکھے مگر طلبہ کی تعداد برائے نام، تینوں مدرسوں کے بچے ایک مدرسہ میں بہ سہولت پڑھ سکتے ہیں، تعدُّدِ مدارس بقدر ضرورت میں کوئی حرج نہیں بلکہ ہونا چاہئے مگر اس طرح نہیں ہونا چاہیے جیسے وہاں

دیکھا کہ بیچ میں ایک مکان ہے اس جانب ایک مدرسہ مسجد اور اُس جانب ایک مدرسہ مسجد، دونوں دیوبندی الفکر عالم ہیں، دونوں مدرسوں میں سب سے شاندار جگہ مہمان خانہ ہے، کارپیٹس، بیڈس، کولرز، ہیٹرز، قیمتی ٹائیلٹ اور باتھ روم عالی شان صوفہ سیٹ وغیرہ۔

مدارس میں مہمان خانہ بھی بے شک ایک ضرورت ہے مگر شریعت میں ضرورت کی بھی کوئی تعریف ہوگی نا؟ اسی گاؤں کے ایک مدرسہ میں تو معلوم ہوا کہ جو مسجد زیر تعمیر ہے ناظم صاحب کی خواہش ہے کہ وہ مسجدِ رشید کی طرح لگے، اس کے لئے ہر ممکن صرفہ فرمایا جارہا ہے، بعض لوگ دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء جیسی جامعات کی تعمیروں کا حوالہ دیتے ہیں مگر ان کو سوچنا چاہیے کہ وہ تاریخی مقامات اور عالمی مراکز ہیں، متعدد اور متنوع کام وہاں سے ہوتے ہیں، دنیا بھر سے لوگ ان کی زیارت کیلئے پہونچتے ہیں ان مراکز سے تقابل کوئی معنی نہیں رکھتا، پھر یہ بھی تو دیکھیں کہ آج ڈیڑھ صدی کے بعد ان کو یہ حیثیت حاصل ہوئی ہے، آغاز جس طرح ہوا اور کام جن جانفشانیوں اور قربانیوں سے سرانجام ہوتے رہے، ان کو کیوں نہیں دیکھا جاتا؟

دارالعلوم دیوبند کے ایک ذمہ دار استاذ نے بتلایا کہ کسی صاحب کے شدید اصرار پر وہ مدرسہ کے جلسے میں گئے، کچھ لوگ جمع تھے بیان ہوا، بعد میں مقامی لوگوں نے بتلایا کہ یہ سب لوگ دوسری جگہ سے جمع کئے گئے ہیں، مقامی کوئی نہیں اس لئے کہ سب ان کی حرکتوں سے نالاں ہیں، آپ ذرا مدرسہ کی تحقیق کر لیجئے، انہوں نے مدرسہ دیکھنا چاہا تو رات ہوجانے کا بہانہ کر کے ٹال مٹول کرتے رہے، پھر جب دکھانا ہی پڑا تو معلوم ہوا کہ ایک چھوٹی سی عمارت ہے اسی کے دروازے پر ایک شعبہ کا بورڈ تھا، کھڑکی پر ایک شعبے کا بورڈ تھا، کسی اور جگہ ایک شعبے کا بورڈ تھا، ایک اور مدرسہ میں خود میرا جانا ہوا دو کمرے اور آٹھ شعبے ہیں، خوب اشتہار ہوتا ہے اور خوب وصولی کی جاتی ہے، پیسہ جو آرہا ہے انہی کاغذی تشہیرات پر صرف ہورہا ہے، کام ہر شعبے میں برائے نام ہے، جبکہ بڑے بڑے کام کرنے والے اداروں میں بھی تشہیر پر اتنا صرفہ نہیں کیا جاتا، ظاہر ہے کہ جب آدمی کا مقصود شہرت و دولت ہو تو اسے کام سے کیا لینا دینا؟

یہ چند متفرق باتیں مدراس اسلامیہ میں مالیات کے بے ڈھنگے استعمال کی جو میں نے لکھی

ہیں اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ بہت سے مدارس جو غیر ذمہ دار علماء نے کھول رکھے ہیں جن کی کوئی شوریٰ ہے نہ ہی کوئی موثر سرپرست ہے جو ذمہ دار پر اپنا اثر رکھتا ہو ان کی وجہ سے ایک طرف مدارس کی بدنامی و بے اعتمادی میں اضافہ ہوتا جارہا ہے، دوسری جانب قوم کا سرمایہ بے محل صرف ہوتا جارہا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تحریکِ مدارس کی برکتیں اُٹھتی چلی جارہی ہیں، اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اربابِ مدارس ان امور پر غور کریں اور مالیات میں امانت و دیانت کی اہمیت کو نظر انداز نہ کریں، بلکہ اپنے اکابر کے مزاج ومنہاج پر مستقیم رہنے کی کوشش کریں۔ انہی خطرات کی وجہ سے ہمارے اکابر اولاً تو عہدوں اور منصبوں سے دور بھاگتے تھے، اور کوئی ذمہ داری زبردستی ڈال ہی دی جاتی تو پائی پائی کے بارے میں جواب دہی کا احساس رکھتے تھے۔ حضرت مولانا یوسف بنوریؒ کے بارے میں پڑھا تھا کہ وہ فرماتے تھے: مدارس کا دنیا کے لئے چلانا آخرت کا سب سے بڑا عذاب ہے اور آخرت کے لئے چلانا دنیا کا سب سے بڑا عذاب یعنی انتہائی مجاہدہ ومحاسبہ کا کام ہے۔ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب مدرسوں کی ذمہ داری اور سرپرستی قبول کرنے سے بہت گھبراتے تھے اور فرماتے تھے کہ شخصی طور پر کسی معاملت میں خیانت ہو جائے تو جب احساس ہو آدمی اس سے معافی مانگ کر یا تلافی کر کے عہدہ برآ ہو سکتا ہے مگر قومی املاک واموال میں خیانت کرنے والا کس کس سے معافی مانگ سکتا ہے؟ کسی ایک آدمی کی چیز تو ہے نہیں۔ اسی لئے حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ نے وصیت فرمائی تھی کہ دینی اداروں کے پہلے تو ذمہ دار بنیں ہی نہیں اور اگر ضرورت پر بنا پڑے تو معاملہ ایسا رکھیں کہ مدرسہ سے تو ہمیں کچھ ملنا باقی ہو مگر ہمارے ذمے مدرسہ کا کچھ نہ نکلے۔ بے شمار واقعات ہمارے اکابر کے ایسے موجود ہیں کہ باوجود حساب وکتاب صاف ستھرا رکھنے اور اور مالیات میں خوفِ خدا کا لحاظ رکھنے کے بھی وقفے وقفے سے احتیاطاً مدرسہ میں چندہ دیتے رہتے تھے کہ انجانے میں بھی کوئی بے احتیاطی ہو گئی ہو تو اس طرح تلافی ہو جائے۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے اسلاف کا سچا جانشین بنائے بالخصوص مالیات کے باب میں غایت احتیاط کی صفت نصیب فرمائے۔ آمین

دعوتِ فکر و عمل

اساتذۂ کرام کی خدمت میں

چند دردمندانہ معروضات

مولانا صلاح الدین سیفی مدظلہٗ*

حضرت مولانا دامت برکاتہم کا یہ مضمون ماہنامہ ''الاحسان'' میں چند ماہ قبل نگاہِ اولین (اداریہ) میں شائع ہوا تھا جس میں مدارسِ دینیہ کے اساتذہ کرام کی خدمت میں تدریسی وتربیتی پہلو سے متعلق چند فکر انگیز تجاویز پیش کی گئیں، جو عملی میدان میں انشاءاللہ معلمین و مدرسین کے لئے نافع ثابت ہوں گی، اسی افادہ کے پیشِ نظر ادارہ اسے شاملِ اشاعت کر رہا ہے۔ ازمرتب

عام طور پر جب بھی طلبۂ عزیز سے ملاقات ہوتی ہے تو اول وہلہ میں مصافحہ کے بعد جو دعا کی درخواست کی جاتی ہے وہ امتحان میں کامیابی سے متعلق ہوتی ہے، یہ عاجز یہ کہہ کر دعا دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دونوں جہاں کے امتحان میں کامیاب فرمائے، یہ بھی عجیب بات ہے کہ آج تک کسی طالب علم نے آخرت کے امتحان کی کامیابی کیلئے دعا نہ کرائی، غور کرنے کی بات ہے دنیا کے امتحان راتوں کی نیند اُڑا دیتے ہیں، اگر آخرت کی فکر لاحق ہو جائے تو آدمی کتنے گناہوں سے بچ سکتا ہے۔

مقصدِ امتحان:

مدارس اسلامیہ میں سہ ماہی، ششماہی، سالانہ امتحانات رکھنے کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ طالب علم فکر سے ان تمام مباحث پر ایک نظر ڈال لے جن کو غفلت سے سنا، یا غیر حاضری کی نظر ہو گئے، امتحانات میں فیل ہونے کے ڈر سے اور ترقی رک جانے کے خوف سے طلبۂ عزیز رات رات بھر جاگتے اور مطالعہ میں مصروف رہتے ہیں، اس محنت کا نتیجہ وہ کامیابی کی شکل میں دیکھتے

ہیں، ٹھیک کہا گیا ہے **''من جدّ وجد''** امتحان کی تیاری کرنے میں کئی دفعہ طالب علم کی نیت صرف علمی کامیابی اور اپنے ہم عصروں سے بازی لے جانا ہوتی ہے، جو بہت ہی کم قیمت چیز ہے، اس موقع پر نیت کو درست کرنا ضروری ہے، نیت و دعاء یہ ہو کہ پیارے اللہ! امتحان سامنے ہے میں اس میں جو پڑھ رہا ہوں یہ دین ہے، مجھے ایسی فہم عطا فرمایئے کہ تھوڑے وقت میں کتاب سمجھ بھی جاؤں ذہن میں محفوظ بھی کرلوں، اس پر عمل کی بھی توفیق مل جائے اور آگے پھیلانے کے لئے قبول بھی کر لیجئے، اگر اللہ رب العزت کی طرف سے یہ تحفہ مل جاتا ہے پھر اگر دنیا کے امتحان میں فیل بھی ہو جائیں تو جیت ہی جیت ہے، اور اگر ہزار کامیابی کے باوجود یہ کامیابی نہ ملے تو سراسر خسارہ ہی خسارہ ہے۔

چنانچہ دنیا کے امتحان کی تیاری میں دنیا کی واہ واہ، دنیا کی عزت ہرگز مقصد نہ ہو بلکہ دائمی کامیابی اور اللہ رب العزت کی دائمی رضا کا اس امتحان کو ذریعہ بنائیں، اس کے لئے مطالعہ، مذاکرہ کر کے کوشش بھی کریں اور دعاؤں کا سہارا لے کر اللہ کی مدد بھی مانگیں۔

طالب علم کیسا ہو؟

ہر وہ شخص جو کسی چیز کا متلاشی ہو اُس کو طالب کہا جاتا ہے، مدارس دینیہ میں تعلیم حاصل کرنے والے افراد کو طالب علم کہا جاتا ہے چاہے وہ بچے ہوں یا عمر کے کسی اور مرحلے میں زندگی گذار رہے ہوں لیکن عجیب بات ہے کہ مدارس میں پڑھنے والا ہر بچہ طالب علم نہیں ہوتا، طالب علم تو تب ہی جب کہ اس کے اندر علم کی طلب ہو، یہاں تو حال یہ ہے کہ کوئی والد کے اصرار پر آیا ہے، کوئی ماں کی دیرینہ آرزو کی وجہ سے آیا ہے غرض کہ مدارس میں پڑھنے والے اکثر بچے وہ ہیں جو ذاتی طلب یا شوق کی وجہ سے نہیں آتے بلکہ کسی اور کے شوق وجذبہ کے تحت مدارس میں داخل ہوتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب طلب ذاتی نہیں ہے تو علم میں رسوخ، کچھ آگے بڑھنے کا جذبہ، کچھ حوصلہ سرے سے سرد ہوتا ہے، جس کا نتیجہ مدارس سے فرار، بیزاری اور زمانہ تعلیم میں غافلانہ زندگی، سیل فون کے تماشے، دوستیاں اور دماغ شیطانی وشہوانی خیالات کا مرکز بنا رہتا ہے۔

جب کہ دوسری طرف اسکول میں جانے والے طلبہ کو دیکھتے ہیں کہ وہ ہر وقت شوق کے ساتھ

اپنے کاموں میں منہمک اسکولوں کی طرف ہشاش بشاش وقت کی پابندی، غیر حاضری شاذ ونادر بلکہ غیر حاضری کا بہانہ ڈھونڈتے رہنا، تعلیم کے وقت تعلیم کے سوا ہر کام اچھا لگنا، اہم درس اور مضمون کو معمولی سے عذر پر چھوڑ دینا یہ آج کے دینی طالب علم کی پہچان ہے، یہ سب کیوں؟ اور اس کا حل کیا ہے؟

یہ وہ سوال ہے جس کا جواب معلوم کر کے سنجیدگی کے ساتھ اس کو نافذ کرنے کی ضرورت ہے ورنہ کہیں ہم اور یہ ادارے جو قوم کے بڑے گاڑھے خون پسینوں کی کمائی سے وجود میں آتے ہیں، اس پر فتن دور میں معمولی اور رسمی چیز بن کر نہ رہ جائیں۔

اسکول جانے والا شوق سے اس لئے جاتا ہے کہ اس تعلیم کا نفع اس کے سامنے ہوتا ہے، اس کا فائدہ وہ دل میں محسوس کرتا ہے، جب کہ دینی طالب علم مدرسے کی طرف جاتے ہوئے اس لئے بوجھل قدم اٹھاتا ہے کہ اس کے سامنے نہ فائدہ ہے نہ اس کا شوق ہے۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ طلبۂ عزیز جو مدارس کی طرف آرہے ہیں چاہے تو وہ والد کے اس جذبے کے تحت آرہے ہوں کہ بچہ پڑھ لے گا تو آخرت میں کامیاب ہو جائیں گے یا والدہ کی اس امید کے تحت آرہے ہوں کہ قیامت کے دن سُرخروئی کا سبب بنے گا یہ سب جذبے اس طالب علم کے ذاتی نہیں ہیں یہ تو کسی اور کے دل کی چاہت ہے جس دن یہ جذبے اور فوائد ہر طالب علم کی ذاتی تمنا اور آرزو بن جائیں گے اس دن طالب علم حقیقی معنی میں طالب علم بن جائے گا۔ اس کے لئے ایک تجویز تو یہ ہے کہ داخلہ کے بعد کچھ دن تک مدارس میں طلبۂ عزیز کو آمد کا مقصد، اہمیت، ذوق وشوق، اسلاف کے واقعات، ان کا مجاہدہ، آج کی راحت اور نعمت کے فوائد یہ ابتدائی چند دن طلبۂ عزیز کے اندر کوٹ کوٹ کر بھر دیئے جائیں اس کے لئے ان اساتذہ کرام کے مواعظ اور مجالس کا انتخاب کیا جائے جو انتہائی تجربہ کار، مشفق، عشقِ الٰہی وعشقِ رسول سے سرشار اور صاحب نسبت ہوں۔ نیز طلبۂ عزیز کو مطالعہ کی اہمیت بتلا کر اس کا شوق انہیں پیدا کیا جائے۔

جب طالب علم کسی عبارت کا مطالعہ کرتا ہے تو دو باتیں ہوتی ہیں یا تو وہ اس کو سمجھ جاتا ہے یا نہیں سمجھتا، جب نہیں سمجھتا تو ایک بات تو سمجھ میں آجاتی ہے کہ میں کچھ نہیں سمجھا یہ مطالعے کی بہت

بڑی کامیابی ہے اس لئے کہ جب یہ احساس پیدا ہو گیا کہ میں کچھ نہیں سمجھا تو یہ سوال بن گیا اب جب استاذ سبق پڑھائیں گے یہ سراپا طلب بن کر بیٹھے گا کہ جس عبارت کو میں نہ سمجھ سکا دیکھیں استاذ محترم کیا سمجھاتے ہیں اب جب استاذ حل کریں گے تو طالب علم خوش ہوگا کہ جس عبارت کو میں نہ سمجھ پایا استاذ نے کتنی آسانی سے اس کو حل کر دیا وہ یاد بھی رکھے گا اور استاذ کا قدردان بھی ہوگا۔

مطالعہ کے بعد طالب علم کو مذاکرہ کا بھی عادی بنانا چاہیے اس سے انداز بیان صاف ستھرا ہوتا ہے، استاذ محترم حضرت مولانا سید ذوالفقار احمدؒ نے ایک بار فرمایا کہ جو طالب علم مذاکرہ نہیں کراتا وہ نہ تو مدرس بن سکتا ہے۔ نہ معلم بن سکتا ہے۔ نہ مصنف بن سکتا ہے۔ نہ مقرر بن سکتا ہے۔ اس لئے کہ اندازِ افہام وتفہیم سے بالکل نابلد ہوتا ہے۔

آج کل مدارس میں ہر درجہ کے اندر ایک دو طالب علم مذاکرہ کرانے والے ہوتے ہیں، باقی تمام گونگے بن کر صرف سمجھنے کا فریضہ انجام دے رہے ہوتے ہیں یا پھر جسمانی حاضری دے کر روح کی آزادی کے ساتھ تخیّل کے دوش پر بیٹھ کر محو پرواز ہوتے ہیں اور اپنے جہاں سے بے خبر سارے جہاں سے باخبر ہونے کی ذمہ داری نبھارہے ہوتے ہیں، لہذا بہتر تو یہ ہے کہ تین یا چار افراد کا حلقہ بنا کر ہر ہر طالب علم الگ الگ کتاب کا مذاکرہ کرائے تا کہ ہر ایک ذمہ دار نہ مطالعہ کر کے آئے پھر جب ذوق بن جائے گا تو ہر کتاب کو ذمہ داری سے پڑھنے والا بنے گا۔

استاذ وشاگرد کا رشتہ

مدارس دینیہ میں تعلیم وتدریس کی خدمات انجام دینے والے قابل احترام اساتذہ تنخواہ دار ملازم ہرگز نہیں بلکہ معلم انسانیت، انسانوں کے سب سے بڑے محسن رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقاصد بعثت کی تکمیل کرنے والے ہیں، جن کو معلم بنا کر ہی مبعوث کیا گیا تھا ''انما بعثت معلما'' (ابن ماجہ) یہ وہ حضرات ہیں جنھوں نے امت کی نشاۃ ثانیہ کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھائی ہے، یہ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روشن مستقبل کے ضامن ہیں، اگر لوگ اینٹ اور پتھر کی عمارتیں تعمیر کر رہے ہیں تو یہ حضرات لوگوں کے دلوں میں انسانیت کی تعمیر کاری کر رہے ہیں، اگر لوگ جسمانی راحت وآسائش کا سامان مہیا کرنے کے پیچھے لگے ہوئے ہیں تو یہ دلوں کی دنیا کو آباد کرنے کی سعی

پیہم کئے جارہے ہیں۔

مقام ومرتبہ جتنا بڑا ہوتا ہے ذمہ داریاں بھی اتنی بڑی ہوتی ہیں، اور تربیت ومردم سازی کی اس عظیم ذمہ داری سے سبکدوشی اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب کہ استاذ وشاگرد کے درمیان رشتہ مستحکم واستوار ہے اور اس تقدس مآب رشتہ کو ان بنیادوں پر قائم کیا جائے جن پر یہ قائم ہونا چاہئے۔

استاذ وشاگرد کا رشتہ حاکم ومحکوم کا نہیں بلکہ مشفق باپ اور مطیع بیٹے کا ہے، استاذ اپنے شاگرد کے لئے گھنے سایہ کی طرح ہوتا ہے، جب شاگرد کسی پریشانی کا شکار ہوتا ہے تو وہ استاذ کی آغوش میں پناہ حاصل کرتا ہے، یہ رشتہ محبت، شفقت، احترام، خیرخواہی، نرمی اور مہربانیوں کی بنیادوں پر قائم ہونا چاہیے تب وہ اپنے مثبت نتائج اور خوش کن اثرات ظاہر کرتا ہے۔

آج کل دیکھا یہ جارہا ہے کہ یہ پاکیزہ رشتہ کمزور ہوتا جارہا ہے چنانچہ اساتذہ کی زبانوں پر شاگردوں کی شکایت اور اظہار نفرت ہے تو شاگردوں کے دلوں میں اساتذہ سے نفرت وعداوت کے جذبات ہیں حتی کہ بعض مرتبہ دونوں ایک دوسرے کا منھ دیکھنے کو تیار نہیں ہوتے، آخر کیا وجہ ہے کہ یہ رشتہ اتنا کمزور ہوگیا کہ محبت کی جگہ نفرت اور شفقت کی جگہ جذبۂ انتقام نے لے لی، نتیجہ وہی ہے جو ہمارے سامنے ہے کہ کھیپ کی کھیپ نکل رہی ہیں لیکن "مردکار" تلاش بسیار کے باوجود ندارد۔ یہ اتنا بڑا المیہ ہے اس پر خون کے آنسو روئے جائیں کہ امت کا عظیم سرمایہ جان ومال کی شکل میں ہمارے ہاتھوں ضائع ہورہا ہے، کیا روز محشر جوابدہی کے مرحلے سے ہمیں گذرنا نہیں ہوگا؟ اس مسئولیت اور ذمہ داری کی ادائیگی کے بارے میں بارگاہ رب العزت میں کیا ہم سے سوال نہیں کیا جائے گا؟

اس مقدس رشتہ کو استوار کرنے اور رجال کار پیدا کرنے کے لئے اساتذہ ومعلمین کی خدمت میں بصد احترام چند گذارشات پیش کی جاتی ہیں:

- ہر طالب علم ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہے، اس کی جان، مال، وقت، صلاحیتیں ہر چیز امانت ہے، انہیں صحیح جگہوں پر استعمال کرکے ان کو پروان چڑھانا ہماری ذمہ داری ہے اور اس ذمہ داری پر اللہ تعالیٰ کے یہاں باز پرس ہونے والی ہے۔

● وظیفۂ تعلیم وتربیت ادا کرتے ہوئے صفت احتساب مستحضر رہنی چاہیے۔

● ہر طالب علم کو اپنا محسن سمجھنے کہ اگر طلبہ نہ ہوتے تو اپنا علم کس کو پہنچاتے، انہوں نے ہمیں ثواب حاصل کرنے کا موقع دیا۔

● ہماری ذمہ داری صرف علمی مواد طلبہ کے ذہن تک پہنچا دینا ہی نہیں بلکہ ساتھ ساتھ اعمال صالحہ حسنِ اخلاق اور اچھے کردار کا نمونہ پیش کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری بداخلاقی و بدکرداری ہماری اچھی باتوں کو قبول کرنے سے مانع بن جائے۔

● ہر بات کی تفتیش، ہر جگہ نگرانی اور ہر غلطی پر سزا طلبہ میں جرأت، بے ادبی اور بے حیائی پیدا کرتی ہے۔استاذ جب تک اپنے سلوک و برتاؤ سے طلبہ کو یہ یقین نہ دلادے کہ وہ حقیقت میں ان کا خیر خواہ ہے وہاں تک طلبہ اس سے کماحقہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

● طالب علم سے اگر کوئی غلطی ہو جائے تو معافی مانگنے پر معاف کر دیا جائے اور پھر بار بار اس کی غلطی کا تذکرہ نہ کیا جائے، نیز معافی کی درخواست کرنے پر اگلی پچھلی سب باتیں یاد کر کے طعنے نہ دیئے جائیں، بہت سی مرتبہ استاذ ناراض ہو کر اپنی ناک کا مسئلہ بنا لیتے ہیں کہ یا تو میں مدرسہ میں رہوں گا یا وہ، جس کے نتیجہ میں اہتمام کی طرف سے استاذ کی طرفداری میں طالب علم کا اخراج عمل میں آتا ہے، یہ مناسب نہیں، کسی طالب علم کا اخراج کر دینا آسان ہے لیکن اگر قیامت کے دن سوال کیا گیا کہ اس طالب علم کو کیوں محروم کر دیا تھا؟ تو کیا جواب ہو گا؟ کیا پتہ وہ خاندان کا پہلا فرد تھا جو علم حاصل کر رہا تھا یا اگر وہ پڑھ لیتا تو اللہ تعالیٰ اس سے دین کا کوئی بڑا کام لے لیتا۔

● طالب علم کی عزت نفس کا خیال رکھا جائے، لہذا سب کے سامنے سزا دینا یا ذلیل کرنا مناسب نہیں، تنہائی میں بلا کر خیر خواہی کے جذبے سے سمجھایا جائے یا عام خطاب کر کے اس غلطی پر متنبہ کر دیا جائے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ کوئی کوتاہی دیکھتے تو فرماتے: مابال اقوام کہ لوگوں کو کیا ہو گیا کہ وہ ایسا ویسا کام کرتے ہیں۔

استاذ کو چاہیے کہ طلبہ کے گھریلو حالات بھی معلوم کریں، اس سے طالب علم کی اہمیت دل میں آئیگی کہ کوئی یتیم بچہ ہے جس کی ماں لوگوں کے گھروں میں کام کر کے اس کے اخراجات

پورے کرتی ہے، کسی کا باپ شرابی ہے، کسی کا ماں باپ دونوں نہیں ہیں اور جوان بہن لوگوں کے گھروں میں کام کر کے خرچ پورا کرتی ہے، یقیناً ایسے طلبہ کس قدر توجہ اور شفقت کے محتاج ہیں۔

● استاذ کو طلبہ کے لئے دعا کا بھی خاص اہتمام کرنا چاہیے، خاص طور پر جو طلبہ کمزور ہوں ان کے لئے دعا اور صدقہ بھی کرنا چاہیے، اس عاجز نے زمانۂ تدریس میں اس کا تجربہ کیا حتی کہ روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی ایسے طلبہ کے لئے دعا کی درخواست کی اور ان کے حال میں واضح فرق محسوس ہوا۔

انداز تعلیم و تربیت:

● تربیت اور اصلاح کے سلسلہ میں معلم انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریق تربیت کو ہی اپنانا چاہیے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقۂ تربیت میں دو وصف بہت نمایاں ہیں (۱) نرمی (۲) رحمت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اقوال وافعال سے امت کو نرمی کی تعلیم دی، چنانچہ ارشاد فرمایا: ''ان اللہ رفیق یحب الرفق ویعطی علی الرفق ما لا یعطی علی العنف'' (مسلم)

(اللہ تعالیٰ نرمی کرنے والے ہیں، اور نرمی کو پسند کرتے ہیں اور نرمی پر وہ کچھ دیتے ہیں جو سختی پر نہیں دیتے) یعنی انسان اپنے کسی مقصد تک پہنچنے کے لئے اگر نرمی کا اسلوب اختیار کرتا ہے تو سختی کا طریقہ اختیار کرنے کے مقابلہ میں زیادہ بہتر نتائج حاصل کر سکتا ہے۔

ایک حدیث میں فرمایا کہ: جس کو نرمی سے کچھ حصہ ملا اس کو خیر کا حصہ مل گیا اور جو نرمی سے محروم ہوا وہ خیر سے محروم رہ گیا۔

نیز عملی اعتبار سے اخلاق نبوی میں نرمی کس قدر غالب ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک اعرابی مسجد نبوی میں آکر پیشاب کر دیتا ہے اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نرمی سے بلا کر اسے سمجھاتے ہیں حتی کہ جب صحابہؓ روکنے جاتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منع فرماتے ہیں۔

ایک اعرابی آکر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چادر مبارک اس زور سے کھینچتا ہے کہ بدن پر نشان پڑ جاتا ہے اس کے جواب میں آپ کا مسکراتا چہرہ سامنے آتا ہے۔

اس سے بڑھ کر غزوۂ احد میں چند صحابہ کرامؓ سے آپ کے حکم کے خلاف ورزی ہوتی ہے نتیجۃ مسلمانوں کا بھاری نقصان ہوتا ہے اور خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دندان مبارک شہید اور پیشانی مبارک زخمی ہوجاتی ہے لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نرمی کا دامن چھوٹنے نہیں پاتا، یہ بڑی نعمت تھی جسے اللہ تعالیٰ نے بطور امتنان کے ذکر فرمایا: ''فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللهِ لِنتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ '' (اللہ کی رحمت ہی تھی جس کی بناء پر تم نے ان لوگوں سے نرمی کا برتاؤ کیا، اگر تم سخت مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ تمہارے آس پاس سے ہٹ کر تتر بتر ہوجاتے)

ذرا غور کیجئے کہ مربی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور تربیت پانے والے حضرات صحابہؓ ہیں، پھر بھی کہا جارہا ہے کہ اگر نرمی کے بجائے ان پر سختی ہوتی تو یقینا ایسی مطیع وفرمانبردار جماعت بھی ساتھ چھوڑ جاتی۔

اب ہم اپنے طریقۂ تربیت پر نظر ڈالیں کہ طریقۂ نبوی (جس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا) کے موافق ہے یا مخالف؟ حال تو یہ دیکھا جارہا ہے کہ کوئی غلطی قابل عفو نہیں اور بعض غلطیوں پر ناقابل برداشت زدوکوب، درسگاہوں کے باہر کئی کئی دنوں کا شرف قیام، طلبہ واساتذہ کے سامنے رسوائی وغیرہ، یہ سب باتیں استاذ وشاگرد کے رشتے کو کمزور کررہی ہیں۔حتی کہ بعض دفعہ طلبہ واساتذہ کے درمیان دشمنی بدزبانی اور دست درازی تک بات پہونچ جاتی ہے۔

اگر یہ سب ہورہا ہے تو" خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ " کا حکم کس کے لئے ہے؟" وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ط " کی ترغیب کیا ہمارے لئے نہیں ہے؟'' من کظم غیظا و ھو یستطیع '' کی فضیلت کی ہمیں ضرورت نہیں؟

اس ناروا سلوک کی وجہ سے کئی دفعہ طلبہ استاذ کے بیمار ہونے کی دعا کرتے ہیں، قرآن مجید ہاتھ میں لے کر زبان سے گالیاں بکتے ہیں، حدیث کی کتاب پر ہاتھ رکھ کر بے دھڑک جھوٹ بولتے ہیں، دھوکہ دہی کے عادی اور ماہر بن جاتے ہیں، اس لئے کہ جانتے ہیں کہ سچ بولنے پر نقد سزا بھگتنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے، رہی بات آخرت کی تو اللہ غفور الرحیم ہے۔

بے جا سختی سے اصلاح تو کیا ہوتی مزید فساد پیدا ہوتا ہے، چنانچہ نامناسب سختی سے

- انسان کی شخصیت مجروح ہو جاتی ہے۔
- اپنا اعتماد کھو دیتا ہے۔
- طالب علم کے دل میں سختی کرنے والے کی نفرت آتی ہے۔
- طالب علم بزدل اور بے حیاء بن جاتا ہے۔
- طالب علم سختی کے خوف سے ہی اطاعت کرتا ہے، شوق اور محبت کے ساتھ نہیں۔

علامہ ابن خلدون ''مقدمہ ابن خلدون'' میں تحریر فرماتے ہیں:

جن طلبہ، غلاموں اور خادموں کی تربیت ظلم وتشدد اور مغلوبیت سے ہوتی ہے ان پر مغلوبیت اور تنگ دلی غالب آجاتی ہے، نشاط وچستی ختم ہو جاتی ہے اور سستی کے عادی بن جاتے ہیں، جھوٹ اور خباثت ان کی طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے اس وجہ سے کہ خوف ہوتا ہے کہ اگر سچ کہیں گے تو دست درازی ہوگی، لہذا استاذ کو اپنے شاگرد کے بارے میں اور باپ کو اپنی اولاد کے بارے میں یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ ان کی تادیب واصلاح میں ظلم وتشدد اور خودمختاری سے کام نہ لیں۔

نرمی کی ضرورت خاص طور پر اس وقت ہوتی ہے جب طالب علم سے کوئی ناروا سلوک، کوتاہی اور حکم کی مخالفت ہو جاتی ہے ایسے موقع پر اکثر مربیوں کی عقلیں اُڑ جاتی ہیں اور سوائے سختی اور مار پٹائی کے علاوہ کوئی بات سجھائی نہیں دیتی اور اپنے زعم میں وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے اس کی اصلاح کر دی یا غفلت دور کر دی، لیکن یہ غلط فہمی ہے کسی طالب علم پر یہ طریقہ کارگر ہو گیا تو ضروری نہیں کہ سب پر ہی اثر انداز ہو جائے اور یہی واحد علاج ہر ایک کے لئے استعمال کیا جائے۔

اساتذہ اور مربیوں کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ہماری ذمہ داری تعلیم وتربیت کی کوشش کرنا ہے، کسی طالب علم کے دماغ میں علم کو بٹھا دینا یا اس کی مکمل اصلاح کر دینا یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے، جو چیز ہمارے اختیار میں نہیں ہے اور ہماری ذمہ داری بھی نہیں اس کو حاصل کرنے کے لئے ہم ایسا طریقہ اختیار کریں جس کے نقصانات اتنے زیادہ ہوں کہاں کہ عقلمندی ہے؟ نیز بہت سی مرتبہ یہ مصلح گناہ کا مرتکب ہوتا ہے، اور اصلاح کے نام پر فساد ہوتا ہے۔

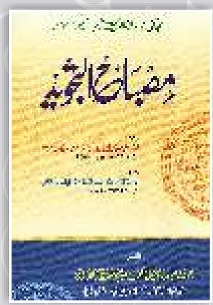
دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام اساتذہ اور مربیوں کو ان گذارشات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

جامعہ سے چھپی ہوئی دیگر کتابیں



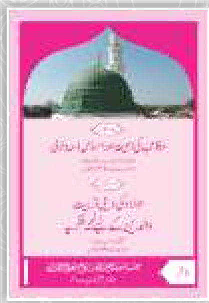


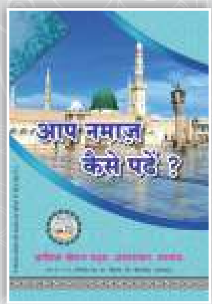


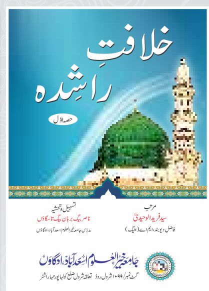




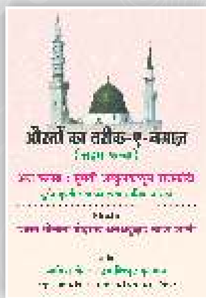














ملنے کا پتا

شعبۂ نشر و اشاعت جامعہ خیر العلوم اسعد آباد، ادگاؤں

گٹ نمبر/۱۰۹۹ اشرول روڈ تعلقہ شرول ضلع کولہاپور مہاراشٹر